R N 2186/57

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۷ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ دسمبر ۱۹۶۱ء

نادم سیتاپوری

اکبر الہ آبادی کی دو غیر معروف کتابیں

اکبر الہ آبادی نے ایک "طنز گو" شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی اور یہی در اصل ان کا "دائرۂ فکر و عمل" تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی مشرقی تہذیب عموماً اور اسلامی معاشرت خصوصاً جس انقلابی جھنور میں ہچکولے کھا رہی تھی اکبر کی حساس فطرت نے اس کا مطالعہ بڑی گہری نگاہوں سے کیا تھا۔ ایک سچے۔ دیندار اور بے تعصب مسلمان کی حیثیت سے انھیں صرف اپنا مذہب ہی عزیز نہیں تھا، بلکہ وہ "فلسفۂ مذاہب" کی سماجی۔ مجلسی اور ثقافتی اسپرٹ کے بارے میں بھی ایک خاص "نقطۂ نگاہ" رکھتے تھے اور باوجودیکہ ان کے خیالات پر تصوف کا ہلکا سا عکس موجود تھا پھر بھی وہ اسلام کو نہ تو محض "عبادتی" "مذہب" سمجھتے تھے نہ "خانقاہی"۔ ان کی ساری کائنات شعری "اگر ایک طرف "خدا اور رسول" سے وابستگی کی دعوت دیتی ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو ایک ایسے "جادۂ عمل" کی طرف بلاتی ہے جہاں مسلمان کوئی "مافوق البشر" انسان کا درجہ نہیں رکھتا۔ جہاں صرف "حور و قصور" کا تصور اس کی نجات کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ "اسلام" نام ہے انسانیت کے صحیح تصورات کا۔

اکبر کے طنز و مزاح میں ایک ایسا ہی "پیغام" ملتا ہے جس کا ایک بڑا حصہ صرف اسلامی مذہب و کلچر سے وابستہ کیا جا سکتا ہے اور ان کا یہ "دائرۂ عمل" صرف ان کی شعری زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنے اس "مشن" کے لئے انھوں نے اس سے ہٹ کر بھی کچھ کام کیا ہے جس سے ان کے "اذکار" عام طور پر خالی نظر آتے ہیں، اور شاید کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ اپنے اس "مشن" کے سلسلہ میں انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں کافی جد و جہد کی تھی۔

اکبر نے نثر نگار کی حیثیت سے شہرت نہیں پائی، اور غالباً وہ "نثر نگار" تھے بھی نہیں۔ ان کی نثری زندگی کے کچھ خد و خال ان کے "مکاتیب" میں نظر آتے ہیں اور ان میں "خطوط نگاری" کی پوری ترقی یافتہ بے ساختگی اور روانی بھی موجود ہے۔ لیکن ان خطوط کو "مکاتیب غالب" کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک بلند پایہ مفکر اور اپنے دور کے ایک کامیاب طنز گو شاعر کے خطوط ہیں اور بس!

اور اکبر کی یہ دو کتابیں بھی نہ تو ان کی تصنیف ہیں اور نہ صحیح معنوں میں تالیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ بلکہ "ترجمے" ہیں۔ انگریزی سے اردو میں۔ اور دوسری کتاب میں کچھ "انتخاب" بھی ہے جو اردو اخبارات سے کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا تعلق مسلمانوں کی تعلیمی تحریک اور مصر و ترکی کے سیاسی حالات سے ہے۔

پہلی کتاب "دلفرڈ اسکاون بلنٹ" کی کتاب (فیوچر آف اسلام) Future of Islam کا اردو ترجمہ ہے جسے اکبر نے ۱۸۸۲ء میں اس وقت ترجمہ کیا تھا جب وہ علی گڑھ میں "منصف" تھے اور "علی گڑھ تحریک" کے اگر پرشور حامیوں میں نہیں تھے تو ان کا شمار "سرسید" کے مخالفین میں بھی نہیں تھا بلکہ جہاں تک اس کتاب کی اشاعت کا تعلق ہے اس کے معاونین میں "سرسید" کا نام یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت تک سرسید اور اکبر کے تعلقات اچھے خاصے خوشگوار و شگفتہ تھے اور اکبر کی ان سرگرمیوں کو "سرسید" کی پوری پوری تائید حاصل تھی۔

یہ کتاب [illegible]ء میں پہلی بار "مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ لمیٹڈ" میں چھپی تھی اور غالباً اس کا دوسرا ایڈیشن پھر شایع نہیں ہوا۔ کتاب کی ضخامت ۱۵۹ صفحات ہے اور قیمت پانچ روپیہ ہے۔ کتاب کے آخر میں "جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ" کی مہر کے اوپر یہ عبارت "قلم" سے بڑھائی گئی ہے۔

" اطلاع - یہ کتاب مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ لمیٹڈ میرٹھ میں حسب فرمائش جناب مولوی سید اکبر حسین صاحب منصف علی گڑھ چھاپی گئی اور ہر ایک کتاب پر مہر جماعت ثبت کی گئی، جس کتاب پر یہ مہر نہ ہو وہ مسروقہ سمجھی جائے گی۔" فقط

مہر جماعت

کتاب کے سرورق پر انکشاف کیا گیا ہے کہ :-

" مصنف نے اس شعر عربی کو اصل کتاب انگریزی کا زیب عنوان کیا ہے :"

ما تنقذ الدر بنشر عقدہا

یعود احسن فی النظام واجود

(نہ ہو تو مایوس و دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی
زیادہ تر حسن و مد کی لڑے گوندھیں گے بار دگر یہ موتی)

ابتدا میں اکبر کی لکھی ہوئی ایک "تمہید" شامل ہے جس میں کنور لطف علی خاں رئیس طالب نگر و اسپیشل مجسٹریٹ کول (ضلع علی گڑھ) کے اس تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جو انھوں نے اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں پیش کیا تھا۔ اس تمہید کے نیچے " مقام علی گڑھ۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۰۴ء" لکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد ہی صفحہ ۶ پر ایک طویل فہرست ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت و ترجمہ میں اکبر سے اشتراک عمل کیا تھا۔ اس لمبی چوڑی فہرست میں زیادہ تر نام تعلقداران اودھ، رؤسا، وکلا اور بعض ایسے حضرات کے ہیں جن سے اکبر کے براہ راست تعلقات تھے غالباً۔ چند نام ملاحظہ ہوں :-

۱۔ آنریبل سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔

۲۔ (امیر الدولہ) سر راجہ امیر حسن خاں والی محمود آباد۔

۳۔ مرزا محمد عباس (بیگ) صاحب سول سروس اسسٹنٹ کمشنر جبر وولی (غالب کے حقیقی بھانجے)۔

۴۔ کنور محمد عبد العلی خاں رئیس چھتاری۔

۵۔ مولوی محمد کریم صاحب ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ (مولانا عبد الماجد دریابادی کے ماموں)

اکبر نے ابتدا میں اس ترجمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں اس ترجمہ کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

" مصنف (ولفرڈ) نے یہ کتاب صرف اپنے ہم ملکوں اور بالخصوص پارلیمنٹ انگلستان کو اسلام کی حالت کی توجہ دلانے کے لئے تصنیف کی تھی۔ ان کا یہ مقصود نہ تھا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو۔ نہ اس کا ترجمہ کیا جائے۔ "مسٹر حمید اللہ سلمہ" نے ایک جلد کتاب انگلستان سے اپنے پدر عالی رتبہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ملاحظہ کو بھیج دی تھی۔ مولوی صاحب مدوح کی اجازت سے میں نے اس کتاب کو پڑھا اور اس کے مضامین نے اس کے ترجمہ پر مجھ کو مجبور کیا۔ ہنوز ترجمہ ختم نہ ہوا تھا کہ "مسٹر بلنٹ صاحب" خود ہندوستان میں تشریف لائے اور بمقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ انھوں نے ایک مسودہ دیباچہ بطور ضمیمہ "دیباچہ اول" کے تحریر فرماکر مجھ کو دیا جس کا ترجمہ میں اس کتاب کے ساتھ شامل کرتا ہوں "۔

(صفحہ ۳-۴)

" ولفرڈ " نے یکم مارچ ۱۹۰۴ء کو اس ترجمہ کے لئے جو "دیباچہ ثانی" لکھا اس میں رقم طراز ہیں :-

"کتاب "فیوچر آف اسلام" کو زبان اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی میں اپنی بے انتہا مسرت ظاہر کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو ایک "لائق اور تسلیم یافتہ مسلمان" نے دنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے کے لائق سمجھ کر پسند اور منتخب کیا۔ اور میرے دل پر اس بات کا بڑا ہی اثر پڑا کہ میری محنتوں کو مسلمانان ہندوستان نے تسلیم کیا اور مجھ کو ایک "بیگانہ شخص" اور خواہ مخواہ دخل در معقولات کرنے والا نہیں سمجھا بلکہ دوست سمجھا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید میں نے اپنی کتاب میں ایسے الفاظ اور فقرات مندرج کئے ہیں جن پر اب تین سال کے بعد کہ اس عرصے میں مجھ کو اسلام سے زیادہ تر واقفیت اور محبت پیدا ہو گئی ہے "

(صفحہ ۱۱)

یہ کتاب " ولفرڈ " کے ان سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۸۸۱ء میں اخبار " فورٹ نائٹلی ریویو " کے لئے لکھے تھے اور پھر بعد میں انھیں مضامین میں کچھ تغیر و تبدل کر کے ۱۸۸۲ء میں کتابی شکل دے دی تھی۔ یہ مضامین اول تا آخر اس " سیاسی مسئلے " کے گرد گھومنے والے وہ " شہ پارے " ہیں جو انگریزوں نے مسئلہ خلافت (ترکی) کے سلسلے میں اس دور کی سیاسی فضا میں چھوڑ رکھے تھے اور اس سلسلے میں انگریزوں کا ایک منظم مشن کئی حصوں میں تقسیم ہو کر مسلمانوں کے دوست و دشمن کے روپ میں پھیلا ہوا تھا۔ " ولفرڈ " بھی اسی مشن کے ایک ممبر تھے جنھیں " اسلام دوستی " کا لبادہ اڑھایا گیا تھا حالانکہ اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ نہ محض محدود تھا بلکہ بالکل سطحی و سرسری تھا۔ اپنے اسی مشن کے سلسلے میں انھیں کئی اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا ضرور موقع ملا تھا اور اس سفر نے یقیناً ان کی معلومات میں ایک حیرت انگیز اضافہ کر دیا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک پڑھے لکھے سیاستداں کی حیثیت سے انھوں نے اپنے مشن کے مقاصد کی اچھی وکالت کی تھی۔

انقلاب سن اٹھارہ سو ستاون کے بعد ہندوستانی مسلمان عام طور پر انگریزوں کی جس "سیاست کاری" کا شکار ہو چکے تھے ان میں " ولفرڈ " جیسے چالاک سیاستدانوں کی بڑی ساندان تھی۔ چنانچہ یہ کتاب بھی ہندوستان پہنچنے کے بعد اچھی خاصی مقبول ہوئی۔ (باقی صلا پر)

اداریہ

ادبی مسائل

(۴)

موجودہ ادیبوں کو تنہائی کا احساس بہت ستاتا ہے۔ مغرب کے کئی ممتاز ادیبوں نے روح کی اس تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جدید تہذیب نے بے حسی، بے کلی، کاروباری اخلاق، لذیت کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ آزاد روحیں جن کے پاس ضمیر کی دولت ہے اور جو اہل غرض اور اقتدار پرست طبقوں سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں، اس جنگل میں اکیلی محسوس کرتی ہیں۔ بڑے شہروں میں لاکھوں آدمی ادھر سے اُدھر گزرتے ہیں، کسی کو پروا نہیں کہ کچھ لوگ بھوک سے مرتے ہیں، سردی انھیں ستاتی ہے، امراض ان کے جسم کو کھا رہے ہیں، ایک بے حس سماج ان کے وجود پر برابر ہتھوڑے لگاتا رہتا ہے۔ سائنس اور صنعت نے بڑی طاقت حاصل کر لی ہے، مگر اس طاقت نے سیکڑوں خطرے پیدا کر دئے ہیں اور آج کے انسان کی زندگی ایک ایسا بھیانک خواب بن گئی ہے جس کی تعبیر کچھ میں نہ آئے۔ امن، دوستی، رواداری، تہذیب، انسانیت کی باتیں ہوتی ہیں اور لڑائی، نفرت، تنگ نظری، بربریت کا عمل، سیاست داں فریب دیتے ہیں، حکومتیں دفتری نظام کی چکی میں کتنی ہی معصوم امنگوں کو پیس ڈالتی ہیں۔ رواج سہانے خوابوں کا گلا گھونٹتا رہتا ہے، ہر حقیقت ایک سراب بن گئی ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ روحیں جن کے پاس اقدار کی دولت ہے ایک قسم کا خلا محسوس کرتی ہیں۔

مگر ہمارے خیال میں یہ تنہائی حقیقی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا فرار ہے۔ فرد اس وقت تنہا محسوس کرتا ہے جب اس کے سامنے ادب، سماج اور تہذیب کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا۔ جب وہ سماج میں اچھی اور بری طاقتوں کی چشمک نہیں دیکھ سکتا جب وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ بعض فرسودہ تصورات مر کر بھی بڑی ہلاکت آفرینی کر سکتے ہیں، بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں جن کا جادو جلد نہیں ٹوٹتا۔ بہت سے لوگ پرانے طریقوں کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ اپنے آپ کو نئے سانچوں میں نہیں ڈھال سکتے۔ وہ سماج سے اپنے آپ کو یکسر الگ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً آج سائنس داں اور ماہرین صنعت حکمراں ہیں۔ بعض شاعر اور ادیب ایسے نظام سے جس میں سائنس داں اور ماہرین صنعت کی اتنی پوچھ گچھ ہے، اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے کیونکہ ان کا شاعر اور ادیب کا روایتی تصور ہے، وہ آج کے شاعر اور ادیب کی ذمے داری کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ شاعری اور سائنس ایک دوسرے کی ضد نہیں، ایک دوسرے کو مدد دیتے ہیں۔ شاعری کی ایک سائنس ہو یا نہیں لیکن سائنس کی ایک شعریت ہے اور اس شعریت کا احساس آج کل کے شاعر کے لئے ضروری ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ پہلے شاعر اور سماج ایک ایسا نقطہ تھے جو دائرہ بھی تھا۔ پھر شاعر سماج کے دائرے میں مرکزی نقطہ بن گیا۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب شاعر اس نقطے پر پہنچ گیا جو دائرے کے اندر ہے مگر مرکز میں نہیں۔ اس کے بعد شاعر کا نقطہ سماج کے دائرے کی سطح پر پہنچا اور رفتہ رفتہ اسے توڑ کر باہر نکل گیا۔ آج جو ادیب اور شاعر تنہائی محسوس کرتے ہیں وہ اس نقطے پر ہیں جو سماج کے دائرے سے باہر ہے۔ اگر وہ سماج کے دائرے کے اندر ہونگے تو اس دائرے کی طاقت اور رفاقت سے بھی انھیں حصہ ملے گا اس لئے ادیب کی تنہائی کا مسئلہ جو مغرب کے صنعتی تمدن نے پیدا کیا ہے اور اسکی پرچھائیں ہمارے کچھ ادیبوں کو بھی ستانے لگی ہے ایک گمراہ کن مسئلہ ہے۔ ادیب تنہا نہیں ہے کیونکہ موجودہ سماج بالکل لعنت نہیں ہے، اسکی اپنی لعنتیں ہیں اور اپنی رحمتیں۔ ان کے رشتے اور نوعیت کو سمجھنا چاہئے اور پھر ادیب اور سماج کے ازلی اور ابدی رشتے کو۔ آدمی محض خیال ہی نہیں محض عمل بھی ہے۔ اسے سماج کی کچھ قدروں سے کچھ دوسری قدروں کی خاطر برابر مقابلہ کرنا ہے۔ وہ تنہا کیسے ہو سکتا ہے۔ انسانیت کے صدیوں کے معیار جو روز بروز خوب سے خوب تر کی جستجو میں کام آ رہے ہیں، اسکے ساتھ ہیں۔ وہ حسن کی کسی ایک کرن، وقت کی کسی ایک سمت، تہذیب کے کسی ایک نقش کے ساتھ وفادار نہیں، وہ انسانیت کے کارواں کے ساتھ ہے جو برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کیا ہوا اگر کچھ لوگ اس سے کٹتے جاتے ہیں، اس میں برابر اور لوگ آتے رہتے ہیں۔

آندھرا پردیش، اُردو کانفرنس

۲۳، ۲۴، ۲۵ دسمبر کو حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر ایک اُردو کانفرنس ہو رہی ہے جس کی صدارت ڈاکٹر تارا چند فرما رہے ہیں۔ اس کانفرنس میں یوں تو زبان، ادب اور صحافت کے اہم مسائل پر بھی بحث ہوگی مگر اس کا اصل مقصد آندھرا پردیش میں اُردو کے حقوق کی حفاظت کے لئے مناسب تجاویز سوچنا ہے۔ آندھرا کے اس علاقے میں جو تلنگانہ کہلاتا ہے اُردو کو ثانوی زبان کا درجہ ضرور دیا گیا، مگر ابھی تک عملی حیثیت سے اُردو کے چلن میں وہاں بہت سی دشواریاں ہیں۔ انجمن کی حیدرآباد کی شاخ بڑا اچھا کام کر رہی ہے اور وہاں کے دوسری زبانوں کے حامیوں کی بھی اسے تائید حاصل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آندھرا پردیش میں اُردو کو ثانوی زبان کا درجہ مستقل طور پر حاصل ہوگا اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم، عدالتوں اور دفاتر اور دوسرے سماجی اور قومی اداروں میں اُردو کو مناسب حق ملے گا۔ یہ دور صرف حکومت کے سامنے عرض معروض کا نہیں، اپنے طور پر بہت کچھ کرنے کا ہے۔ ہمیں اپنے حقوق ضرور اپنی قومی حکومت کے سامنے پیش کرنے چاہئیں، مگر اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو دوست اُردو زبان و ادب کی اس طرح سرپرستی کریں کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی ترقی کو روک نہ سکے۔

اِدھر اُدھر سے

قاہرہ میں جشنِ ٹیگور

۱۱ر نومبر سنہ ۶۱ء کو قاہرہ کے ممتاز "نائل ہلٹن ہوٹل" میں ہونے والی ایک استقبالیہ دعوت میں متحدہ عرب جمہوریہ کے وزیرِ تعلیم مسٹر یوسف نے "ٹیگور ہفتے" کا افتتاح کیا۔ یہ استقبالیہ متحدہ عرب جمہوریہ کی آرٹ، لٹریچر اور سماجی سائنس سے متعلق ہائی کونسل نے دیا تھا اس دعوت میں ۵۰۰ سے زیادہ مہمانوں نے شرکت کی جن میں متحدہ عرب جمہوریہ کے وزرا، ممتاز افسر، بڑے بڑے مصنفین، ماہرینِ تعلیم اور سفارت خانوں کے نمائندے شامل تھے۔

مسٹر یوسف نے ٹیگور کی کاوشوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اس شاعر کی عظیم ذہنی اور سیاسی آزادی کی ترجمانی کو بنی نوعِ انسان کا ورثہ قرار دیا۔

اس ہفتے کے دوران میں آرٹ اور لٹریچر کی ہائی کونسل کی زیرِ سرپرستی ٹیگور کے ڈرامے "چترا" کو اسٹیج پر پیش کیا گیا۔

استقبالی دعوت کے پروگرام کے تحت ہندوستانی سفارتخانے کے عملے اور بچوں نے رقص و سرود کے علاوہ ٹیگور کے گانے بھی پیش کئے اور ٹیگور پر ستیہ جیت رے کا فلم بھی دکھایا گیا اور اس فلم کو عربی میں ایک فنی نام بھی دیا گیا۔

۱۲ر نومبر کو مسٹر یوسف نے قاہرہ کے میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں ٹیگور کی مصوری کے نمونوں، تصویروں اور تصانیف کی نمائش کا افتتاح کیا۔ قاہرہ میں ہندوستان کے سفیر اور بیگم عظیم حسین نے ایک استقبالی دعوت دی۔ اس میں وزیروں اور سفیروں کی شرکت کے علاوہ عرب کی ادبی دنیا کے ممتاز اشخاص نے بھی شرکت کی۔

اس ہفتے کے دوران میں متحدہ عرب جمہوریہ کی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سروسوں نے پروگرام نشر کئے جن میں ٹیگور پر تقریریں اور سمپوزیم بھی شامل تھے۔

علامہ اقبال کی قیام گاہ کو محفوظ کرنے کے انتظامات

لاہور ۱۱ر دسمبر میکلوڈ روڈ پر واقع علامہ اقبال مرحوم کی قیام گاہ کو محفوظ کرنے کے انتظامات تیزی سے جاری ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس مکان کی از سرِ نو تعمیر کا کام موجودہ مالی سال کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔

نئی تعمیر میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ پورا مکان بعینہٖ پہلے مکان کے مشابہ ہو اور اس میں کوئی چیز کم یا زیادہ نہ ہو۔ اس مکان میں علامہ اقبال کی مختلف اشیا کو جمع کر کے ایک عجائب گھر بنایا جائے گا۔ علاوہ ازیں ایک لائبریری قائم کی جائے گی جس میں اقبال کی اپنی تصانیف کے علاوہ ان کے متعلق اب تک لکھی گئی تمام کتابیں جمع کی جائیں گی۔

اُردو میں بھی بیلٹ پیپر

سابقہ دونوں عام انتخابات کے برعکس اس دفعہ یوپی میں انتخابات کے موقع پر جو ووٹ (بیلٹ پیپر) استعمال کئے جائیں گے، باوثوق ذرائع کے مطابق ان پر پارٹی کے انتخابی نشان کے ساتھ ساتھ امیدواروں کے نام بھی چھپے ہوں گے، جب کہ پہلے صرف پارٹی کے انتخابی نشان چھپے ہوئے تھے۔

بیلٹ پیپر پر امیدواروں کے نام ہندی میں چھپے ہوں گے۔

چھ اضلاع میں ہندی کے ساتھ اردو میں بھی امیدواروں کے نام بیلٹ پیپر پر چھاپے جائیں گے۔

ان چھ اضلاع میں بریلی، مظفر نگر، بدایوں، شاہجہاں پور اور سہارنپور شامل ہیں۔

اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ شہر کے لئے جو بیلٹ پیپر ہوں گے ان میں بھی اردو میں امیدواروں کے نام چھپے ہوں گے۔

تیسرے پلان میں سنسکرت کی ترقی کے لئے اقدامات

مرکزی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شری مالی نے راجیہ سبھا میں شری بی۔ این۔ بھارگو کے سوال کے جواب میں بتایا کہ تیسرے پنجسالہ پلان میں سنسکرت کے فروغ کے لئے نو اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے پانچ اسکیموں پر پہلے ہی عمل درآمد شروع ہو چکا ہے اور باقی چار اسکیمیں زیرِ ترتیب ہیں۔

وزیرِ موصوف نے کہا کہ جن اسکیموں پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے وہ یہ ہیں: تیروپاتی میں کیندریہ سنسکرت ودیاپیٹھ کا قیام، گروکلوں کی ترقی، سنسکرت میں تحقیقی مطالعہ کے لئے وظائف نیز سنسکرت کی ترقی سے متعلق رضاکاروں کو مالی امداد اور سنسکرت کے مطالعہ کو آسان بنانے کے لئے معیار کے اعتبار سے درجہ بند کتابوں کی اشاعت، نیز سنسکرت کی ایسی کتابوں کی دوبارہ اشاعت جو بازار میں نہ ملتی ہوں۔

انھوں نے مزید کہا کہ جو اسکیمیں زیرِ ترتیب ہیں وہ شبد کوش کی تیاری، سنسکرت پاٹھ شالاؤں کو جدید طرز پر ڈھالنے وغیرہ کے کام سے متعلق ہیں۔

وزیرِ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں سنسکرت اداروں کو ان کی عمارت کی تعمیر وغیرہ کے سلسلے میں ۳۰،۲۷،۹۲ روپے کی امدادی رقوم دی گئی ہیں۔

چینی اسکولوں میں انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت سے

معلوم ہوا ہے کہ عنقریب ہی چین کے اسکولوں میں انگریزی کو ثانوی زبان کی حیثیت دی جائے گی۔ اس دوران میں چین کے ریڈیو اسٹیشنوں نے دوسری زبانوں کے ساتھ انگریزی کا ایک تعلیمی پروگرام بھی شروع کر دیا ہے۔ اب تک چین کے اسکولوں میں اگر کوئی غیر ملکی ثانوی زبان تھی تو وہ صرف روسی تھی۔

ناصر شہزاد

غزل

گیسو یہ کس کے رُخ پہ بکھر کر سنور گئے
اُمڈی گھٹائیں چھٹ گئیں موسم نکھر گئے

میں وسعتِ جہاں میں تمھیں ڈھونڈتا رہا
تم روزنِ خیال سے دل میں اُتر گئے

آج اس دیارِ غم میں کھڑا سوچتا ہوں میں
وہ بستیاں، وہ لوگ، وہ پنگھٹ کدھر گئے

شاید تمھیں تو یاد ہو! خاموش راستو
کس شہرِ پُر طرب کو مرے ہم سفر گئے

تو نے بھی کچھ سُنا کہ تری انجمن میں لوگ
مجھ پہ بھی تیری چاہ کا الزام دھر گئے

ہر سانس میں مہکتے ہیں یادوں کے لالہ زار
تم کتنے رنگ میرے فسانے میں بھر گئے

گزرا اِدھر سے کون کہ گزرے ہوئے سمے
ایک ایک کر کے میری نظر سے گزر گئے

جوزف انور

غزل

انگ انگ میں گوری کے کلیوں کی چٹکار
روپ نگر سے کرنے آئی پھولوں کا بیوپار

پھولوں پر شبنم ہے جیسے رِستے ہوں آنسو
گلشن گلشن پھیل گئی ہے زخموں کی مہکار

پھر آثار بُرے ہیں شاید دردوں کی بارش ہو
پھر دیکھو لہراتی آئی ہے یادوں کی ڈار

یہ کیا کم ہے کہ ہم اپنی جھولی تو بھر لائے
بن مانگے تو ورنہ کس کو ملتی ہے دھتکار

جو لینا ہے آج ہی لے لے کل کیا جانے رام
ہم سے کال جواری اپنی لنکا ہی دیں ہار

چوکھٹ چوکھٹ گھومنے والے من درپن تو دیکھ
تیری خاطر آخر لوں میں کس کس کا اوتار

اپنی کٹیا آگئے انور کیا مشکل کیا چاند
جس میں بس کر کہلائے ہیں ہم بھی دنیا دار

جمیل کلیمی

غزل

لگی ہے آگ گلزاروں میں اکثر
کھلے ہیں پھول انگاروں میں اکثر

دوائے درد لے کر ان کے در سے
صبا آتی ہے بیماروں میں اکثر

مری بربادیوں کے تذکرے بھی
ہوا کرتے ہیں مہ پاروں میں اکثر

قیامت سر اُٹھا کر رہ گئی ہے
ترے پائل کی جھنکاروں میں اکثر

رہے ہیں مشورے تعمیرِ نو کے
شکستہ گھر کی دیواروں میں اکثر

آفتاب شمسی

غزل

درد جب حد سے گزر جاتا ہے
ہجر کے زخم کو بھر جاتا ہے

کیا ہے اس چشمِ فسوں ساز کا راز؟
جس سے پوچھو وہ مُکر جاتا ہے

آپ بھی کھول کے برہم ہو لیں
یوں تو رنگ اور نکھر جاتا ہے

مُطربہ! سوچ لے جانے سے پرے
تیرے نغموں کا اثر جاتا ہے

اب تو جو جاتا ہے محفل سے تری
لے کے اک عزمِ سفر جاتا ہے

جس کو جنت سے نکالا تھا کبھی
آج وہ تا بہ قمر جاتا ہے

ماہر انصاری

غزل

زخموں کے پھول ہیں نہ امیدوں کا بانکپن
بستی ہے دل کی یا کوئی اُجڑا ہوا چمن

جب سے بھلا دیا ہے تری یاد نے مجھے
سونی پڑی ہوئی ہے خیالوں کی انجمن

بہلائیے کہاں دلِ آشفتہ حال کو
تیرے بغیر ایک ہے سب - شہر ہو کہ بن

سر ہو چکا ہے مرحلۂ کوہِ بے ستوں
اب قصرِ خسروی بھی ہے ضربِ کوہکن

آیا ہے کون کوچۂ جاناں میں دیکھنا
بکھرے پڑے ہیں راہ میں کچھ تارِ پیرہن

کچھ اور شمعِ عشق کی لو کو بڑھائیے
پھیلی ہوئی ہے ایک سیاہی کرن کرن

طرزِ کرم تو دیکھئے پیرانِ میکدہ
دیتے ہیں جام نو میں وہی بادۂ کہن

ماہر کہیں سے لاؤ مسرت کی روشنی
دھندلا گیا ہے گردِ الم سے جمالِ فن

اعجاز افضل

غزل

جذبہ و فکر ہم آہنگ ہوئے جاتے ہیں
زخم تھے دل کے شفق رنگ ہوئے جاتے ہیں

پیاس ہے لذتِ ساغر شکنی سے سرشار
میکدے کارگہِ سنگ ہوئے جاتے ہیں

دم ذرا لینے دے اے قافلۂ تیز قدم
اب تو دو گام بھی فرسنگ ہوئے جاتے ہیں

فکر نے چھوڑ دیا شام و سحر کو پیچھے
دائرے وقت کے اب تنگ ہوئے جاتے ہیں

شیوۂ ذہن پہ تنقید کریں کیا افضل
اب تو دل کے بھی عجب ڈھنگ ہوئے جاتے ہیں

عبدالقادر

میسور میں اُردو کی حالت

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اردو کی حالت پر تشویش کا اظہار ہو رہا ہے اور اکثر مقامات پر اردو کا مستقبل تاریک قرار دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "فروغ اُردو" کے اداریہ میں کچھ عرصہ پیشتر یہ جملہ درج تھا۔ "ہمارے صوبہ اُتر پردیش میں اُردو کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔" اُتر پردیش کے بڑے بڑے شہر مثلاً لکھنؤ۔ علی گڑھ۔ رام پور وغیرہ اُردو کے مرکز رہ چکے ہیں اور آج بھی ان مقاموں میں اُردو کے مستند ادیب، اعلیٰ پایہ مصنف، شہرت یاب شاعر اور ہر دلعزیز ناول نگار و افسانہ نویس ملیں گے۔ اُردو کتب کا جتنا ذخیرہ اتر پردیش کی لائبریریوں میں ملے گا ہندوستان کے دوسرے مقاموں کی لائبریریوں میں ملنا دشوار ہے۔ اس کے باوجود مذکورہ بالا لکھنؤ کے اُردو جریدے کے مدیر کہتے ہیں کہ اتر پردیش میں اردو کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ اُردو کی حالت خراب ہونے کا مطلب انھوں نے یہ لیا ہے کہ وہاں اُردو والوں کے لئے عملی دشواریاں پیش آ رہی ہیں جس کے نتیجے میں اُردو جاننے والوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹتی جا رہی ہے۔ دوسرے صوبوں میں جو رواداری اُردو کے ساتھ برتی جا رہی ہے وہ اتر پردیش میں دکھائی نہیں دیتی۔ دوسرے مقاموں میں اُردو کے لئے جو سہولتیں مہیا ہیں وہ اتر پردیش میں حاصل نہیں۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی ایسی نہیں جہاں اُردو ذریعہ تعلیم ہو۔ دستورِ ہند کی رو سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی چودہ زبانوں میں سے ہندی کے قومی زبان بن جانے کے بعد بقیہ تیرہ زبانوں کے ساتھ جس میں اُردو بھی ایک ہے یکساں سلوک ہونا چاہیے مگر جمہوریت کے اس دور میں "فروغ اُردو" والوں کا کہنا ہے کہ اتر پردیش میں جہاں اُردو کی ترقی کے بیشمار مرکز ہیں اُردو کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا جا رہا ہے جو دیگر زبانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

"فروغ اُردو" کے اس بیان کو پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے صوبے یعنی میسور میں اُردو کی کیا حالت ہے جان لینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ کیا یہاں بھی اُردو کیلئے وہی دشواریاں موجود ہیں جو اتر پردیش میں پائی جا رہی ہیں۔ اُردو والوں کے لئے یہاں کیا سہولتیں اور کیا آسانیاں مہیا کی گئی ہیں یہاں اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے یا گھٹ گئی۔ سکول اور کالجوں میں اُردو کا کیا درجہ ہے۔ حکومت کا اُردو کے ساتھ کیا سلوک ہے یہ چند سوالات ہیں جن کے جواب سے ہم میسور میں اُردو کی حالت پہچان سکیں گے۔

میسور میں اُردو کب سے بولی جا رہی ہے اسکی تحقیق عنوان سے بے تعلق ہے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نواب حیدر علی خاں اور آپکے فرزند ٹیپو سلطان شہید کی حکمرانی کے بعد یہاں اُردو کا زیادہ چرچا ہوا۔ ٹیپو سلطان شہید کے دور کی اُردو دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس کے نمونے مل سکتے ہیں۔ مثلاً ٹیپو سلطان شہید کے ایک رشتہ دار کے مسدس ان جنگ میں جام شہادت نوش کر جانے سے ان کو سری رنگ پٹن میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے مزار پر شہادت کے کچھ عرصے کے بعد ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے ایک کتبہ جس کو راقم الحروف نے داستیم میسوری کے سو شعر میں نقل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس دور کے اُردو کے شاعر بھی ملتے ہیں جن کا کلام مشاعروں میں پڑھا جاتا تھا جن کے شاگرد بھی تھے اور جن کی شاعری کی شہرت جنوب ہند سے نکل کر شمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر تسنیم میسوری اور سالک تنکوری کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں سے پہلے ایک اور شاعر المتخلص بہ حیات نے دینی کتاب "مصباح الحیات" لکھی تھی اور آپنے مساجد میں جمعہ کے دن پڑھے جانے والے خطبات بھی نظم میں لکھے تھے جو آج بھی میسور کی بے شمار مسجدوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ میسور کی فضا اُردو کیلئے زمانۂ دراز سے سازگار رہی ہے۔

میسور کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ دوسرے صوبوں کے باشندوں کے برخلاف یہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ مہاراشٹر کے مسلمان مرہٹی بولیں گے۔ مدراس کے مسلمان تامل۔ اور آندھرا کے مسلمان (حیدرآباد کے علاقہ کو چھوڑ کر) تلگو۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر میسور کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ کنڑی ریاستی زبان ہے اسی سبب سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں اب تک یہ خاص رعایت ہے کہ ان کے بچوں کے لئے پرائمری اور مڈل کے مدرسے اُردو پرائمری اور اُردو مڈل کہلائے جاتے ہیں۔ نئے میسور کی تشکیل سے پہلے میسور کے صرف نو اضلاع تھے۔ ان نو ضلعوں میں ہر مقام میں اردو پرائمری اور اُردو مڈل مدارس رہے اور اب تک برقرار ہیں۔ ان نو ضلعوں کے علاوہ حیدرآباد کرناٹک، بمبئی کرناٹک اور مدراس کرناٹک کے علاقوں میں بھی مقامی انجمنوں کی زیر نگرانی نہ صرف پرائمری مدارس بلکہ ہائی اسکول بھی قائم ہیں۔ ان میں سے اکثر ہائی سکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ چنانچہ دھارواڑ، ہبلی، بھٹکل، گلبرگہ، بیجاپور، رائچور، بیدر وغیرہ مقامات میں انجمنوں کی زیر نگرانی ہائی سکول قائم ہیں جہاں اُردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ حکومت کی طرف سے اُردو مدرسوں کی نگرانی کے لئے اُردو داں افسر تعلیم مقرر ہیں۔

جنوبی ہند میں حیدرآباد کے بعد شاید میسور ہی وہ صوبہ ہے جہاں سے معیاری روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ملک کے روزنامہ اخبار انقلاب۔ آزاد اور پاسبان نہ صرف ریاست میسور کے اندر جتنا دکثیر پڑھے جاتے ہیں بلکہ ریاست میسور کے باہر آندھرا اور مدراس کے علاقوں میں بھی ان کی مانگ ہے۔ روزناموں کے علاوہ ہفتہ وار، ماہوار اور سہ ماہی جرائد بھی میسور اور بنگلور سے شائع ہوتے ہیں۔ ہفتہ وار "نقاد" بنگلور سے کچھ عرصہ پیشتر شائع ہوتا تھا جو ایک اعلیٰ معیار ہفتہ وار تسلیم کیا گیا تھا۔ اسی طرح بنگلور ہی سے ماہوار "کائنات" کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا جس میں ملک کے اچھے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس وقت میسور سے "تنظیم میسور" کے نام سے ایک ہفتہ وار شائع ہو رہا ہے۔ بنگلور سے بھی آزاد اور پاسبان کے ہفتہ وار ایڈیشن نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سہ ماہی رسالہ "سوغات" بنگلور سے شائع ہونے لگا ہے جس کے چند ہی شماروں کے بعد یہ رائے دی جا رہی ہے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے بہترین رسائل کی برابری کر سکتا ہے۔ انھیں کے ساتھ ساتھ گاہ گاہ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں سے شائع ہونے والے سالانہ رسالوں میں سے مہاراجہ کالج میسور سے "مخزن"۔ سنٹرل کالج بنگلور سے "نوائے ادب"۔ انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور سے "حیات نو" اور فرسٹ گریڈ کالج

ٹنکورسے "جام ادب" قابلِ ذکر ہیں۔ ان اخباروں اور رسالوں کے نام یہاں درج کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ میسور میں اُردو کی خدمت بجا لانے والوں کی کمی نہیں اور اردو سے دلچسپی رکھنے والے اور اُردو کی حمایت کرنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان رسالوں میں لکھنے والے شمالی ہند کے لکھنے والوں کے برابر تو نہیں لیکن ان سے کمتر درجے کے نہیں کہے جاسکتے۔ اسی سلسلہ میں مرحوم محمود خاں صاحب مصنف "سلطنت خداداد" کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جن کی زیرادارت روزنامہ "اعلان" نکلا جو زیادہ دنوں تک شائع ہو سکا مگر محمود خاں صاحب مرحوم کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا "سلطنت خداداد" کی جہ گیر پروطرز یزی سے اس کے مصنف کو شہرت جاودانہ حاصل ہو چکی ہے۔ "صحیفۂ ٹیپو سلطان" اور "تاج" جیسی کتابوں کا مصنف میسور ہی کا تھا۔ میسور میں اُردو کے خدمت گزاروں میں محمود خاں صاحب مرحوم کے علاوہ دوسرے ادیبوں کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں۔ نسیم میسوری اور سالک ٹنکوری کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے ساتھ نفیس بنگلوری اور خاکی ٹیٹوری کے نام بھی آتے ہیں، جن کی شاعری کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ دورِ حاضر میں ریاست میسور کے مختلف شہروں میں کہنہ مشق شاعر موجود ہیں۔ مقامی مشاعروں میں ان کی شرکت شائقین زبان و ادب کو سیکڑوں کی تعداد میں کھینچ لاتی ہے۔

اُردو والوں کے لئے حکومت سے فراہم کردہ سہولتیں یہ ہیں کہ اُردو پرائمری اور اُردو مڈل کے مدارس کے علاوہ ریاست بھر کے گورنمنٹ ہائی سکولوں میں اُردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور اعداد دیکھے جائیں تو ہر سال ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی کے امتحان میں اُردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے لے کر داخل ہونے والے طالب علموں کی تعداد گھٹتی ہوئی نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی ہی نظر آتی ہے۔ ہاں ایک بات یہ ہے کہ میونسپل کونسل یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی نگرانی میں چلائے جانے والے ہائی اسکولوں میں بہت کم مقاموں میں اُردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

ہائی سکول کے بعد ریاست کے کالج آتے ہیں۔ دیگر مقامات کے برخلاف میسور یونیورسٹی کے انتظامات میں حکومت کا بہت دخل ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال پیشتر میسور یونیورسٹی کے تحت میسور کے یوراجہ اور مہاراجہ کالجوں کو برقرار رکھ لیا گیا اور ریاست بھر کے دوسرے کالجوں کو حکومت میسور کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ یہ بات امید افزا ہے کہ میسور یونیورسٹی کے تحت رہنے والے کالجوں میں اور ریاست کے کل کالجوں میں اُردو ثانوی اور اختیاری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے اور ہر سال یہاں بھی طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی کی جماعتوں میں اُردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے طالب علم ہر کالج میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی نئی اسکیم کے تحت میسور کے مہاراجہ کالج اور ٹنکور کے فسٹ گریڈ کالج میں بی۔ اے میں اُردو "ایک میجر سبجکٹ" کی حیثیت سے بھی پڑھائی جاتی ہے۔ مہاراجہ کالج میسور میں شعبۂ اردو و فارسی و عربی کے ایک پروفیسر کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے میسور یونیورسٹی کے لئے اُردو کے ایک پروفیسر اور ایک لکچرار کا بھی تقرر ہوا ہے جن کی نگرانی میں بی۔ اے کے بعد کی جماعت یعنی اُردو ایم۔ اے کی تعلیم اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ میسور میں اردو کی حالت پہلے سے بہتر ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً پینتیس سال پہلے میسور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی و عربی میں صرف ایک پروفیسر اور ایک یا دو اُردو و فارسی پڑھانے والے مولوی تھے۔ جبکہ آج یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالجوں میں شعبۂ اُردو و فارسی و عربی کے دو پروفیسر، ریڈر اور بیس سے زیادہ لکچرار ہیں۔ اس یونیورسٹی سے اُردو و فارسی میں ایم۔ اے کرنے والے طالب علموں کو میسور میں یا میسور سے باہر ملازمت حاصل کرنے کے مواقع بھی میسر ہیں۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ میسور میں اُردو کے لئے کیا سہولتیں اور آسانیاں ہیں اور حکومت کی جانب سے اس کے لئے کیا رعایتیں ہیں۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھ کر ڈگری حاصل کرنے والے نوجوان سب کے سب برسرِ روزگار ہیں۔ ان میں سے اکثر ملازمت پیشہ ہیں۔

دیگر مقامات میں اُردو کی حالت سے میسور میں اُردو کی حالت کا موازنہ کیا جائے تو اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یہاں اُردو کی حالت اتنی خراب نہیں جتنی کہ دیگر مقامات میں۔ ریاست میسور کے مختلف شہروں میں اُردو کی ترقی کی انجمنیں قائم ہیں جنکی زیرِ نگرانی گاہ گاہ ادبی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ان جلسوں میں تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ ایسے جلسوں سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ شہر بنگلور کے محمد علی ہال میں کچھ عرصہ پیشتر ایک اُردو کنونشن کا اجتماع ہوا تھا۔ اس موقع پر ریاست کے مختلف مقاموں سے اردو کے ادیب، شاعر، مصنف، بعض اخبار کے مدیر اور شائقین ادب اُردو جمع تھے۔ اس موقع پر ریاست کے وزیر تعلیم نے جن الفاظ میں اُردو کی حمایت کی تھی وہ قابلِ تعریف اور لائق تحسین ہے۔ میں ان کی تقریر کے اقتباس پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

> "دلی، لکھنؤ، علی گڑھ، رام پور اور حیدرآباد سے گزرتی ہوئی
> اب اُردو بنگلور (یعنی ریاست میسور) آ پہنچی ہے یہ مقام اسکو
> راس آیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہاں یہ پھلے اور پھولے گی"

وزیر تعلیم کے اس بیان پر میسور میں اردو کی موجودہ بہتر حالت اور تابناک مستقبل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

انجمن کا خبر نامہ

چانسلر پٹنہ یونیورسٹی سے بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کے وفد کی ملاقات

بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کا ایک وفد زیر قیادت جناب محمد ایوب ایڈوکیٹ صدر انجمن ۶ دسمبر ۱۱ بجے دن میں راج بھون میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملا۔ اور پٹنہ یونیورسٹی سینیٹ نے جو امتحانات میں ہندی کو لازمی طور پر ذریعہ امتحان بنانے کا فیصلہ کیا ہے اس سے لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے سامنے جو دقت اور دشواری پیدا ہوگئی ہے اور اُردو کی اعلیٰ تعلیم کی راہ میں یونیورسٹی نے جو رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس سے چانسلر یونیورسٹی کو وفد نے آگاہ کیا۔ وفد نے اس صورت حال سے بھی آگاہ کیا کہ اس فیصلہ کے خلاف عوام میں سخت اضطراب بے چینی رونما ہے، جس کا مظاہرہ بھی ہو رہا ہے۔ جناب ذاکر حسین چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے لسانی اقلیتی طلبہ کی دقتوں اور دشواریوں کا اعتراف کیا اور اس سلسلے میں گرچہ کوئی فیصلہ کن بات انھوں نے نہ کہی پھر بھی یہ وعدہ کیا کہ ارکان حکومت اور ارباب یونیورسٹی تک طلبہ کے اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ کو پہنچا دیں گے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار نے اُردو کے بہی خواہوں کو یہ مشورہ دیا کہ اُردو کی تعلیم کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کی ضرورت ہے اور اردو دوستوں کی توجہ اس طرف بھی ہونی چاہیے۔ وفد میں جناب محمد ایوب ایڈوکیٹ کے علاوہ حضرت مولانا عثمان غنی پھلواروی نواب زادہ مہدی حسین سابق ایم۔ ایل۔ سی۔ نثار احمد خاں ایڈوکیٹ ممبر سینٹ پٹنہ یونیورسٹی۔ جناب مولوی عبد المالک وکیل سابق ایم۔ ایل۔ سی۔ کامریڈ علی اشرف۔ شری سنیل کمار کرجی جناب سید غضنفر نواب دانش۔ جناب اجمل جامعی شیر گھاٹی۔ جناب غلام سرور ایڈیٹر سنگم۔ جناب عزیز اشرف، اور جناب مولانا بیتاب صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے ماسوا کالجوں اور یونیورسٹی کے نمائندوں میں طلبہ رضوی برق، حامد چھپروی، نیر اعظم، مستجاب علی خاں اور دیگر گیا آرہ، بہار شریف وغیرہ کے نمائندے بھی وفد میں شریک تھے۔

(ایک نامہ نگار)

بزم جگر ترچناپلی کا ماہانہ مشاعرہ

قومی خدمتگار ترچناپلی کی عمارت میں ۹ دسمبر ۱۹۶۱ء شب میں بزم جگر کا تیسرا ماہانہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر شاکر نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔ جناب حیدر سکریٹری نے سامعین کا استقبال کیا اور بزم جگر کے زیر اہتمام ۲۰ جنوری ۱۹۶۲ء بمقام ٹے ور ہال منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے اردو دوست احباب سے مزید گزارش کی۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر شاکر نے اپنی صدارتی تقریر میں سامعین کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے کی ترغیب دلائی۔ قاضی بلدہ اور بزم جگر کے صدر جناب مولوی سید عبد الغنی نے بزم جگر کے مقاصد کو واضح کیا اور ہر اُردو وا انجمن سے تعاون کا اظہار کیا۔ پھر مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں جناب احمد حیدر فانی، ذکی، زیبائی، شاد، انور، ہاشمی، سبحان، ضو، نیاز، قمر اور اختر نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ جناب انور نائب معتمد کے اظہار تشکر پر مشاعرہ بحسن وخوبی ڈیڑھ بجے شب اختتام کو پہنچا۔ (شیخ داؤد فانی۔ نائب صدر بزم جگر)

بزم مصطفیٰ بھیمڑی کے زیر اہتمام یوم رشید

۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو بسلسلۂ یوم رشید بزم مصطفیٰ کمال لائبریری کونگیٹ کے زیر اہتمام ایک طرحی مشاعرہ حضرت نظر مالیگانوی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں تقریباً ۳۰ ۳۵ مقامی اور بیرونی شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ رشید بھیمڑوی کی شاعری اور زندگی اور پُر خلوص ادبی خدمت پر تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔

مشاعرہ میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔ کارپردازان لائبریری نے رشید سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار جس اعلیٰ سطح پر کیا وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ محفل مشاعرہ کی تزئین بڑی خوبصورتی سے کی گئی اور شعرائے کرام کی بڑی خاطر و مدارات ہوئی۔ مشاعرہ میں ایک کتابچہ جس میں عرفان شرف اور ڈاکٹر مومن محی الدین کے رشحات قلم اور مرحوم کے کلام کا نمونہ شامل ہے مشاعرہ میں تقسیم کیا گیا۔

(جنرل سکریٹری شاخ بھیمڑی)

نشاط ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام مشاعرہ

مورخہ ۱۰ دسمبر کی شب میں قدوائی روڈ پر مالیگاؤں کے مقبول شاعر نشاط شاہدوی کی یاد میں مشاعرہ ہوا۔ جس میں تقریباً دس گیارہ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک تھے۔

اس مشاعرہ میں بمبئی سے خواجہ احمد عباس۔ عزیز قیسی اور جگدیش کنول؛ بھیمڑی سے زیڈ عابد۔ مجید شاداب۔ وسیم حیدرآبادی؛ اور دھولیہ سے عمر فارق؛ اور نگ آباد سے بشر نواز۔ قاضی سلیم مقصود ابو العلائی نے شرکت کی۔

اور مقامی شعراء میں دانش۔ عتیق۔ استاد۔ اسمٰعیل راز شفق، اسلم۔ اشرف غازی نے حصہ لیا تھا۔ صدارت کے فرائض بیرسٹر عبد المجید سالک صاحب نے انجام دیے۔ اور خواجہ احمد عباس نے افتتاح کیا۔ (سلمان جاوید سکریٹری)

ضروری اعلان: براہ مہربانی خط کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

مجلس عاملہ انجمن ترقی اُردو ناندیڑ کا جلسہ

انجمن ترقی اُردو ناندیڑ کی مجلس عاملہ کا اجلاس مسٹر میر شخ شاذلی کی صدارت میں ہوا جس میں تنظیمی امور پر غور کیا گیا۔ بلدیہ ناندیڑ میں اُردو کے تعلق سے اختیار کردہ رویہ پر بھی غور کیا گیا۔ جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ کمشنر اورنگ آباد کے پاس ایک یادداشت روانہ کی جائے جس کے ذریعہ ان سے مطالبہ کیا جائے گا کہ ایسے مقامات پر جہاں پندرہ فی صد سے زائد لسانی اقلیتیں رہتی ہوں وہاں کے بلدیہ کے کاروبار دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اس زبان میں بھی انجام دئے جائیں۔ ضلع ناندیڑ کے مدارس کے سروے کا بھی فیصلہ کیا گیا اور تیسرے عام انتخابات میں اُردو کے مسئلے کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کی مذمت کی گئی اور آندھرا پردیش اُردو کانفرنس کے انعقاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کانفرنس کے لئے ایک پانچ اراکین کا وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ (سکریٹری)

اُردو تعلیم کے لئے تلگو داں مدرسین کے تقررات

حیدرآباد۔ ۱۴ دسمبر۔ مسٹر احمد عبدالمجید ہزاری رکن بلدیہ جگتیال نے اُردو تعلیم کے لئے تلگو داں مدرسین کے تقرر اور اس طرح اُردو تعلیم کے حصول سے طلبہ کو محروم کرنے اور ان کے معیار کو پست کرنے کی پالیسی کے خلاف حکومت سے سخت احتجاج کیا ہے۔ مسٹر عبدالمجید نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ تعلقہ جگتیال کے کئی تحتانی مدارس میں اردو داں اساتذہ کے تبادلے کرکے ان کی جگہ تلگو داں اور اردو سے نابلد اساتذہ کو مقرر کیا گیا ہے جس سے کم سن بچے اسباق سمجھنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں ان میں اس طرح اُردو بیزاری کا رجحان پیدا ہونا فطری امر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم طلبہ کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق سے محروم کرنے کے لئے کسی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ اس صورت حال سے سرپرست اور خود اساتذہ پریشان ہیں۔ مسٹر عبدالمجید نے کہا کہ اس غیر اصولی پالیسی اور تنگ نظری کے مظاہرہ کے خلاف ارباب تعلیمات کو کئی بار متوجہ کیا گیا اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً محضر بھی پیش کئے گئے لیکن کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ انھوں نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں فوری کارروائی کرکے اُردو تعلیم کیلئے صرف اُردو داں مدرسین کے تقرر کا ہی انتظام کرے۔ (سیاست حیدرآباد)

ادارہ مرکز ادب کی ہفتہ وار ادبی نشست

رامپور۔ ۱۵ دسمبر

ادارۂ مرکز ادب کی ہفتہ وار ادبی نشست ۷½ بجے شب ادارہ کے عارضی دفتر واقع زیارت خرم والی پر زیر صدارت فضیلت رامپوری منعقد ہوئی۔ افق مرکزی نے نعت پڑھی۔ سکریٹری ادارہ نے پچھلی نشست کی کارروائی سنائی۔ ارشد علی خاں شگفتہ کا افسانہ ان کی غیر موجودگی میں فضیلت رام پوری نے پڑھ کر سنایا۔ صداقت رام پوری کا افسانہ "گندہ" ہوش نظامی کا مضمون "جوش بحیثیت طنز نگار" خلیل مسعود کا افسانہ "چندا ماما دور کے" فضیلت رام پوری کا افسانہ "نئی منزل نئی راہیں" نزہت ظہور کا طنزیہ "ڈاڑھی" تخلیقی پروگرام میں پیش کئے گئے۔

شعراء میں ساقی عارفی۔ افق مرکزی۔ اشرف تسلیمی۔ طاہر سحری۔ طرب رام پوری اور طاہر نظامی نے اپنا کلام سنایا۔ (سکریٹری)

انجمن اصلاح ادب کی ہفتہ وار ادبی نشست

رامپور۔ ۱۸ دسمبر

انجمن اصلاح ادب کی ہفتہ وار ادبی نشست ۸ بجے شب زیر صدارت وصی اقبال منعقد ہوئی۔ نشست کی باقاعدہ کارروائی شروع ہونے سے قبل نہال حیدری اور افق رام پوری کے استعفوں پر غور کیا گیا اور بالاتفاق رائے دونوں کے استعفوں کو منظور کر لیا گیا۔

آج کی نشست میں طرحی اور غیر طرحی دونوں دور ہوئے جس میں مندرجہ ذیل شاعروں اور نثر نگاروں نے شرکت کی۔ شعراء میں مشتاق رام پوری۔ نسیم رام پوری۔ رشک احسنی۔ وفا صمدی شکیل احمد ساز۔ افسر آغا اور طرب رام پوری کے نام شامل ہیں۔ جاوید صدیقی کی غزل شکیل احمد ساز نے پڑھی۔ نثر نگاروں میں وصی اقبال اور سلطان اشرف نے شرکت کی۔ وصی اقبال نے افسانہ بعنوان "نیا سویرا" پیش کیا۔ تخلیقی پروگرام کے بعد صدر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (سکریٹری)

عقیلہ المنجی

میری ماں

ماں کے عظیم موضوع پر اردو ادب میں پہلی قابل لحاظ تخلیق اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" تھی۔ دوسری تخلیق جناب سلطان احمد کا کتابچہ "میری ماں" ہے۔ یہ تصنیف ہے تو نثر میں، لیکن اس کو نثر کی کس صنف میں رکھا جائے۔ انشائیہ، افسانہ، مقالہ؟ کسی ایک صنف میں نہیں، اس لئے کہ یہ بیک وقت تینوں ہے۔ اس میں انشائیے کا انبساط، افسانے کا اسرار اور مقالے کی ثقاہت سبھی موجود ہیں۔

عالمی ادب میں ماں کے موضوع پر سب سے مشہور تخلیق گورکی کا ناول ہے لیکن اس ناول کی خصوصیت کیا ہے جناب سلطان احمد ہی کی زبانی سنئے:۔

"ماں کے نام پر گورکی کا یہ ناول ایک بورژوا استقرار کو گرنے کا اظہار کی کوشش کا نتیجہ ہو سکا۔ اخلاقی قدروں کے گھٹ جانے کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس رشتے کے وقار کو کسی مسلک کی مقبولیت کا ذریعہ بنا لیا گیا جو وہ بجائے خود اس کے مقام اور احترام کا حق ادا کرے، یعنی ناول میں ماں ایک ضمنی کی حیثیت سے زیادہ بلند نہ ہو سکی حالانکہ وہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے دنیا کی ہر رفاقت سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔"

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ زیر تبصرہ تصنیف میں مادری رشتے کے اعلیٰ روحانی جوہر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں آدرش جذباتیت ہے اور نہ غرض مندانہ استحصال، صرف خلوص کی گرمی اور تخیل کی بلندی ہے۔ ماں کی محبت کا یہی وہ خاص تصور ہے جس کا ولولہ اور رقت "میری ماں" کی ہر سطر سے عیاں ہے۔

ویسے تو کتاب پانچ چھوٹے چھوٹے بابوں میں منقسم ہے لیکن ہر باب میں موضوع پر تین پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو ایک ماں اور بیٹے کی جذباتی وابستگی کا رقت انگیز قصہ ہے۔ پھر اس مثالی رشتے کی فلسفیانہ تعبیر پیش کی گئی ہے۔ اسکے بعد ماں اور بیٹے کے روابط کا تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس بیان دستے کی اس طرح تین دائروں میں تقسیم صرف تجزیے کی سہولت کیلئے کی گئی ہے ورنہ مصنف کے جوش بیان کا تسلسل اسکی اجازت نہیں دیتا۔ فی الواقع ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بغیر کسی منصوبے کے غم عشق اپنی فراوانی، وسعت اور گہرائی کے سبب غم روزگار بن گیا ہو۔ اصل محرک ماں کی محبت اور اس کا غم ہے لیکن چونکہ یہ غم یکتہ بین اور عالم انسان کا غم ہے اس لئے فطری طور پر اسکی اظہار کے پیرایے میں ہر جگہ بحث اور مطالعے اور فکر کے عناصر موجود ہیں۔ یہ بات مصنف کی سلامتی طبع اور ذہنی صلاحیت کی دلیل ہے۔ وہ اپنے شدید الم کو اپنے ذاتی جذبات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس میں ایک ... کی چاشنی ملاکے اسے دو آتشہ کر دیتا ہے۔ اس طرح اسکے ہاتھ ذرہ میں زندگی جو گئی ہے بلکہ بڑھ گیا ہے جس کی کامیابی کا معیار بھی ہے۔ ایک خاص شخصی مضمون میں اس عمر رفتہ کی تنگی کا نتیجہ چند نہایت خیال انگیز نکتوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے:

"موت ہو یا بیدائش ہمارے لئے دونوں جینی ہیں، ہم صرف ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ پیدا ہونے پر بچہ روتا ہے اور عزیز و قریب ہنستے ہیں یا خوشیاں مناتے ہیں لیکن موت کی صورت اسکے برعکس ہوتی ہے یعنی زندگی کی شادمانی یہ ہے کہ جب موت آوے تو مرنے والے کے چہرے پر تبسم ہو اور دوسرے گریہ کناں۔ زندگی کے انجام پر موت اسی اشارہ کرتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔"

[جنگ عظیم اول کے بعد کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریک خلافت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:۔]

"ہندوستانی اور اسلامی دونوں مسائل ایک ساتھ پیش ہوتے ہوئے اور دونوں کا حل ہندو مسلم اتحاد قرار پایا۔"

اسی طرح دوسرے باب کے آخر میں ماں کی رحلت پر اپنی تسکین کیلئے یہ تبصرہ پیش کرتے ہیں کہ تمام انسان کی تمام فتوحات، فراق کے باوجود ماں کے رد و ادائی عرصے کا نتیجہ ہیں۔ اسی ذیل میں چند بڑے معنی خیز مقولے بھی ڈھل گئے ہیں:۔

"اگر کوئی چاہے کہ آفتاب سے مقابلہ کرے اور اس کی تیز رفتاری کو مات کر دے تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ وہ آفتاب نکلنے سے پہلے خود طلوع ہو اور آفتاب کو پہلے طلوع ہونے کا موقع نہ دے۔"

"مگر انسان کا کام جو اس کا کمال نہیں، بلکہ بچے کو پالینا کمال ہے۔"

زیر نظر تخلیق گرچہ انشائیہ نہیں، لیکن اسلوب میں انشاپردازی کا وصف نمایاں ہے۔ تقریباً ہر بیان کے آخر میں ابوالکلام کے انداز پر چند مضمون کی طرح برمحل اشعار چسپاں کئے، بعض اوقات رشید احمد صدیقی کی جملہ طرازی اور نکتہ وری، اور ان سب پر حاوی بلاغت سے ملی جلی سلاست۔ اس مخلوط صورت سے ایک نئے اور زیادہ متوازن اور دلکش اسلوب کا خمیر اٹھنے لگتا ہے۔

لیکن یہ خمیر بیٹھتا نظر آتا ہے جب ہم پاتے ہیں کہ تحریر میں وہ ہمواری، سنجیدگی اور رچاؤ نہیں جو ایک اسلوب کے استقلال کی ضروری شرط ہے۔ تراش خراش کی سختی کی محسوس ہوتی ہے۔ بیان میں کبھی رخنے اور کبھی گرتے سے ابھرتے ہیں۔ تاہم چند مثالیں پر لطف ہیں:۔

"نرگس کا پودا جا بجا وجود سامنے ہوتا۔ گردش کہیں ہوا دم ابھار کتا۔ سفید نرگس کا ڈوبے رسوخ اپنا ہوتا۔"

"محبت اگر رشتوں میں بٹتی ہے تو تقسیم ہو جاتی ہے، مگر جب ایک ہی رخ اختیار کرلے تو بے پناہ ہو جاتی ہے۔"

"لیکن ایک دوسرے کی علیحدگی نہ معلوم کتنے اضطراب کی بجلیاں رکھتی تھی کہ سارے جسم کو لرزا دیتی اور ہم آنسوؤں کے دھندلکے میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے۔"

"غرض تقریباً تہوار اور شادی و غم کی شرکتوں کا سارا بوجھ وہی شخص بخوشی اٹھاتا۔ وہ وقتوں سے بھرتا اور ضرورتوں سے خالی ہوتا۔"

"میری ماں" کا ایک اور وصف تخیل کی رسائی ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے ماں کے رشتے کی تقدیس کے ثبوت میں حافظ شیرازی کی مشہور غزل "این چہ شور است کہ در دور قمری بینم" کا حوالہ دیتے ہوئے یہ نکتہ نکالا ہے کہ اس غزل میں دور قمر کی شورید گی کے سبب زندگی کے تمام رشتوں کے تلون کا بیان ہے، لیکن مادری رشتہ استثنائی طور پر اس زد سے باہر ہے۔ اسی طرح برسات میں ایک قطعہ زمین کی سبزہ آغازی سے یہ توقع کہ ماں کا قالب بھی موت کے بعد خدا کے باران کرم سے اسی طرح زندہ و روشن ہو جائے گا۔ ایسے مواقع پر خلوص کی شدت شعریت کے جوش تک پہنچ گئی ہے۔

ان دلچسپیوں کے باوجود کتاب کا ایک پہلو بہت کھٹکتا ہے۔ بعض مواقع پر موت کے بعد روح کے متعلق ایسی پیچیدہ بحث کی گئی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے، شاید مصنف ایک مردہ ہستی سے فیض و اکتساب کی طرف مائل ہے۔ یہ میلان ماں سے محبت کی انتہا کا ثبوت ہے۔ ذاتی طور پر یہ خیال مصنف کے لئے کتنی ہی تسکین کا باعث ہو، لیکن ایک عام حقیقت کے طور پر اس کی طرف اشارے صرف ذہنی الجھن کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔

بقیہ

اکبر الٰہ آبادی کی دو غیر معروف کتابیں

اور اکبر کے ترجمے کے بعد تو اس کی قدر و قیمت کو گویا چار چاند لگ گئے۔

جیسا کہ اکبر نے تمہید میں ذکر کیا ہے ۱۸۸۴ء میں "ولفرڈ" ہندوستان کے دورے پر آئے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا۔ جگہ جگہ ان کی آمد کے سلسلے میں خیر مقدمی تقریبات منائی گئیں اور شاندار جلسوں میں ان کی تقریروں سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اور ہندوستانی اخبارات نے "ولفرڈ" کی ان تقریروں کو نمایاں طور پر شائع کر کے انگریزی سیاست کی حمایت کی۔ "ولفرڈ" کی انھیں تقریروں کا مجموعہ (سلسلۂ مضامین متعلقہ ہند مسٹر ولفرڈ بلنٹ کی اسپیچیں درباب تعلیم مذہبی اور وہ ایڈریس جو مسلمانان ہند کی جانب سے ان کو دئے گئے) اکبر کی دوسری کتاب ہے جس میں "ولفرڈ" کی تقریروں کے علاوہ وہ ایڈریس بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کی طرف سے انھیں دئے گئے تھے۔ چالیس صفحات کی یہ کتاب ستمبر ۱۸۸۶ء میں "سید المطابع میرٹھ" میں چھپی تھی اور اس کی طباعت کے مصارف کنور محمد فیاض علی خاں رئیس پہاسو ضلع بلند شہر، کنور عبدالغفور رئیس دھرم پور اور امیر الدولہ نواب امیر حسن خاں والی محمود آباد وغیرہ نے برداشت کیے تھے۔ کتاب کے سرورق پر ۱۵ ستمبر ۱۸۸۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

اس زمانے میں اکبر علی گڑھ ہی میں "منصف درجہ اول" تھے۔

میرے پاس اس کتاب کا صرف "حصہ اول" ہی ہے حالانکہ تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ اس کے تین حصے اور بھی ہیں حصہ چہارم میں "سر لیپل گریفن" کے اس مضمون کا ترجمہ بھی شامل ہے جو انھوں نے "ولفرڈ" کی تردید میں لکھا ہے۔

حصہ اول میں صرف ترجمے ہی نہیں ہیں بلکہ بعض اردو اخبارات سے کارروائی اور تقریر کا خلاصہ نقل کر دیا گیا ہے۔ "ولفرڈ" نے اپنے اس دورہ میں لکھنؤ، کلکتہ، پٹنہ اور حیدرآباد وغیرہ جا کر مسلمانوں کے متعدد جلسوں کو خطاب کیا تھا جن میں اس دور کے مسلم عمائدین شریک تھے۔

"ولفرڈ" کا سیاسی مشن جن عظیم سیاسی مقاصد کا حامل تھا ہندوستان پہنچ کر انھوں نے انھیں بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا تھا۔ چونکہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں "سرسید کی تعلیمی تحریک" نے ایک خاص جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور مسلمانوں کی عام توجہات اسی تحریک کی طرف مبذول ہو چکی تھیں اس لئے "ولفرڈ" جب ہندوستان پہنچے تو ان کے ساتھ ایک نیا نعرہ تھا "مسلمانوں کی دینی و مذہبی تعلیم کا احیاء" اور اس سلسلے میں ان کی "سیاسی ژرف نگاہی" ایک پوری سکیم لئے ہوئے تھی۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ اس تحریک کا آغاز "حیدرآباد دکن" سے کیا جائے اور یہاں مسلمانوں کی دینی تعلیم کیلئے "دکن یونیورسٹی" قائم کی جائے۔ ظاہر ہے کہ "ولفرڈ" کے اس نعرہ میں اس دور کے مسلمانوں کے لئے کیا کچھ جاذبیت نہ ہوگی۔ اکبر کے دل میں مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق جو درد و کسک موجود تھی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں وہ کافی ابھر چلی۔ چنانچہ انھیں "ولفرڈ" سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ دل و جان سے ان کے والہ و شیدا ہو گئے۔

ان دونوں کتابوں کے سلسلے میں اکبر نے جس مخلصانہ سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انکی شاعری نے آگے چل کر جو کروٹ لی تھی وہ "رد عمل" تھا، اسی ولفرڈ کی اسکیم کی ناکامی کا۔ ان دونوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد اگر اکبر کے اس شعری دور کا تجزیہ کیا جائے جو "سرسید اور علی گڑھ تحریک" کے خلاف ایک مستقل محاذ کی شکل اختیار کر چکا تھا تو اکبر کی زندگی کا یہ پورا زمانہ سامنے آجاتا ہے۔ اور سرسید اور اکبر کا وہ عہد سامنے آجاتا ہے جب دونوں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب تھے۔

یہ دونوں کتابیں نہ محض مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے ایک تاریخی دور کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ "اکبر و سرسید" کی زندگی کے ان بہت سے گوشوں کو بھی اجاگر کرتی ہیں جب مسلمانوں کی یہ دو عظیم شخصیتیں نظریاتی اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھیں۔ سرسید نے اپنا جو راستہ بنایا تھا وہ مضبوطی کے ساتھ اس پر چلتے رہے اور اکبر اپنی رائے پر قائم رہے کہ مسلمانوں کی دنیوی فلاح دینی تعلیم میں مضمر ہے۔

نظریات کا یہ اختلاف کم و بیش ایک صدی ادھر کا قضیہ ہے جس پر آج کے بدلے ہوئے حالات میں سرسری طور پر کوئی رائے دی نہیں جا سکتی اور نہ اس مختصر مضمون کا یہ دائرہ عمل ہے۔

یہ دونوں کتابیں "ترجمہ" ہونے کے باوجود اکبر کی عملی زندگی کے دو تاریخی پہلو ہیں جن پر شاید ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی اور اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ اتنا کم ہے کہ عوام کی نگاہوں سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اکبر کی "ترجمہ نگاری" کا وہ پہلا آرٹ موجود ہے جس سے ان کی سرکاری ملازمت کا آغاز ہوا تھا اور یہ خصوصیت بہرحال ایسی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انجمن کی مطبوعات

اردو ہندی ڈکشنری	مرتبہ انجمن	قیمت ۲۰ر۰۰
باپو کے قدموں میں	ڈاکٹر راجیندر پرشاد	۱۵ر۰۰
سیاسیات کے اصول (مکمل)	ہارون خاں شروانی	۵ر۰۰
کاروانِ معیشت	نجم الدین شکیب	۶ر۵۰
دھمپد	منور لکھنوی (مترجم)	۳ر۰۰
اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	۵ر۰۰
مرقع افغان	ابرار حسین فاروقی	۳ر۲۵
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵ر۵۰
قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶ر۰۰
ہندوستانی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴ر۵۰
ادبی قومی تذکرے (اول)	کشن پرشاد کول	۶ر۵۰
" " " (دوم)	" "	۴ر۵۰
اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت	۶ر۰۰
کچھ زر کی بابت (مجلد)	ابو سالم	۴ر۵۰
نفسیات افواہ	ولی الرحمٰن	۱ر۲۵
اطلاقی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴ر۵۰
انواع فلسفہ (مجلد)	ظفر حسین خاں	۵ر۵۰
ایک مشرقی کتب خانہ	مبارز الدین رفعت	۳ر۰۰
مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴ر۰۰
مشترکہ زبان	" "	۴ر۵۰
پرچھائیں	آصف علی	۴ر۰۰
حیات اجمل	قاضی عبد الغفار	۸ر۰۰
محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری	۱ر۰۰
یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	۴ر۲۵
اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبد الحق	۱ر۰۰
زنداں نامہ (مجموعہ کلام)	فیض احمد فیض	۲ر۲۵
ذکر حافظ	سجاد ظہیر	۲ر۲۵
تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴ر۵۰
ترقی پسند ادب (نیا ایڈیشن)	سردار جعفری	۳ر۷۵
مقالات حالی (حصہ اول)	حالی	۳ر۲۵
اردو صرف و نحو (جدید ایڈیشن)	مولوی عبد الحق	۱ر۰۰
چند ہم عصر	"	۱ر۲۵
انتخاب کلام میر	"	۲ر۵۰
شکنتلا (اردو ترجمہ)	بیگم قدسیہ زیدی	۲ر۰۰
شکنتلا (ہندی ترجمہ)	بیگم قدسیہ زیدی	۲ر۰۰
سن ستاون	پنڈت سندر لال	۴ر۰۰
نوائے ظفر	خلیل الرحمٰن اعظمی	۳ر۲۵
تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین احمد	[illegible]
آئینۂ حقیقت	پنڈت حبیب الر[illegible]	[illegible]
شوپنہار	مجنوں گورکھپوری	[illegible]
ہندوستانی اخبار نویسی	عتیق صدیقی	[illegible]
دیوان غالب	امتیاز علی عرشی	۲۰ر۰۰
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵ر۵۰
اردو ساہتیہ کا اتہاس	احتشام حسین	۲ر۲۰
انتخاب دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳ر۵۰
سریلے بول	عظمت اللہ خاں	۱ر۵۰

انجمن کی نئی مطبوعات

کچھ ذرے کچھ تارے (مجموعہ کلام)	آنند نرائن ملا	۲ر۵۰
حالی کی ایک جھلک	بیگم صالحہ عابد حسین	۱ر۵۰
اردو غزل (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹ر۰۰
الایام	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۴ر۰۰
سخن مختصر (نیا مجموعہ کلام)	جذبی	۲ر۰۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲ر۰۰
انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲ر۵۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۲ر۰۰
نئے ڈرامے	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۵ر۰۰
دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبد البصیر خاں	۲ر۰۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	۷ر۰۰
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶ر۰۰
شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵ر۰۰
بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲ر۵۰
نئی روشنی	محمد فضل الرحمٰن	۱ر۵۰

شعراء کے انتخابات

مخدوم۔ سکندر علی وجد۔ جگر بریلوی۔ حبیب احمد صدیقی
فیض۔ تاباں۔ شاد عارفی۔ مجاز۔ فراق گورکھپوری۔
اثر لکھنوی۔ جاں نثار اختر۔
ہر انتخاب کی قیمت ۷۵ نئے پیسے

پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا